شیخ محمد اکرامؒ

دیوبند اور علی گڑھ میں ہم آہنگی کے لیے شیخ الہند کی مساعی

مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے بعد دیوبند کے جس بزرگ نے سب سے زیادہ نام پایا، وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن تھے جنھوں نے تحریک خلافت کے آغاز میں وفات پائی اور جن کے مبارک ہاتھ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس ہوئی۔

وہ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ دیوبند میں حصول تعلیم کے بعد پہلے وہاں مدرس اور ۱۸۸۸ء میں صدر مدرس ہوئے اور تینتیس سال تک اس عہدے پر نامزد رہے۔ آپ کے زمانے کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان جو کشیدگی تھی، وہ بڑی حد تک رفع ہوگئی۔ دیوبند اور علی گڑھ کے بانیوں کا آخری سرچشمہ فیض ایک تھا، یعنی ولی اللہی خاندان کی تعلیمات، لیکن ان کے مقاصد اور طریق کار میں بعد عظیم تھا۔ سرسید کا بڑا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضروریات پر تھی۔ پھر سرسید طبقہ امراء کے رکن تھے اور مولانا محمد قاسم جمہور کے نمائندے۔ سرسید کی خواہش تھی کہ اسلامی اقتدار کا وہ سائبان جن کے سایے کے نیچے صدیوں تک جمہور کو آرام ملا تھا اور علماء وصلحاء کو کام کرنے کا موقع میسر آیا تھا، کسی طرح بالکل تباہ وبرباد ہونے سے بچ جائے اور مولانا محمد قاسم کی نظر جمہور اور علماء کی فوری ضروریات پر تھی۔ اس کے علاوہ ملکی معاملات میں دونوں کا طریق کار مختلف تھا۔ جنگ آزادی میں سرسید، مولانا محمد قاسم اور ان دونوں کے ساتھیوں نے حصہ لیا تھا، لیکن سرسید نے ایک فریق کا ساتھ دیا تو دوسرے نے اس کے مخالف فریق کا۔

مولانا محمود الحسن کو بھی علی گڑھ سے کم اختلافات نہ تھے۔ انھیں سرسید سے پیر بھائی یا استاد بھائی ہونے کا بھی وہ ربط حاصل نہ تھا جو سرسید اور بعض بزرگان دیوبند کے درمیان تھا، لیکن خدا کی قدرت ہے کہ ان کے زمانے میں علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلیج پر ہونے کا سامان ہوا۔ ایک تو شاید مولانا محمود الحسن دیکھتے ہوں گے کہ خواہ سرسید اپنی تفسیر میں کچھ لکھیں، لیکن علی گڑھ میں مذہب اور دینیات کا صیغہ تو ارباب دیوبند کے سپرد ہے۔ جو بزرگ اس زمانے میں وہاں ناظم دینیات تھے، وہ داماد تھے مولانا محمد قاسم کے اور نواسے تھے مولانا مملوک علی کے اور فی الحقیقت ان کا شمار بزرگان دیوبند ہی میں ہوتا ہے۔

اسی طرح جہاد کے متعلق جو اختلاف علی گڑھ اور دیوبند میں تھا، اس میں بھی علی گڑھ پارٹی کے شبہات بے بنیاد نہ

تھے، بلکہ جب غدر کے وقت تھانہ بھون میں اس مسئلے پر وہ تاریخی بحث ہوئی جس میں حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے علماء نے حصہ لیا تو ان علماء ہی میں سے ایک محترم بزرگ مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ محدث نے، جو مولانا اشرف علی تھانوی کے استاد اور پیر طریقت تھے، کم وبیش وہی دلائل دیے جن کی بنا پر سرسید نے اس مرحلے پر مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ سے مختلف طریق کار اختیار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے رفقائے کار نے ان دلائل کو قبول نہ کیا اور جب مولانا محمد قاسم نے کہا کہ ''کیا ہم حضرات بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان اور مفلس ہیں'' تو حاجی امداد اللہ، جو ابھی تک مذبذب تھے، ان سے متفق ہو گئے، لیکن یہ کہنا کہ مولانا شیخ محمد کے دلائل بے وقعت تھے یا واقعات نے انھیں غلط ثابت کیا، حقیقت کے خلاف ہوگا۔

مولانا محمود الحسن کو اعتراف تھا کہ اس مسئلے میں ارباب علی گڑھ کے شبہات بے بنیاد نہیں۔ چنانچہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک خطبہ میں کہا ہے: ''اپنے استاد حضرت شیخ الہند سے ہم نے جو خاص باتیں سیکھی ہیں، ان میں سے ایک چیز جہاد کا مسئلہ ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں اس مسئلے پر ملک میں بڑی بحثیں ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ پارٹی جہاد کے معنی نئے طریقے پر کرتی تھی اور اس سلسلے میں ایسے شبہات لاتی تھی جن کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ خدا کے فضل سے ہمیں حضرت شیخ الہند کی صحبت کے فیض سے اس مسئلے میں پورا اطمینان حاصل ہو گیا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کے طلبہ سے اس معاملے میں اگر ہماری گفتگو ہوتی تو ہم انھیں جہاد کا مقصود اصلی صحیح طرح سمجھا سکتے تھے۔''

اس کے علاوہ حضرت شیخ الہند کو احساس تھا کہ ان کے ہم خیال لوگ سکولوں اور کالجوں میں بھی اسی طرح ہیں جس طرح مدرسوں اور خانقاہوں میں۔ چنانچہ آپ نے ان کی طرف دست تعاون دراز کیا۔ آپ کے اس خطبہ صدارت کے، جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمقام علی گڑھ پڑھا گیا، بعض فقرے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے طلبہ سے فرمایا:

> ''اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے تاریخی مقاموں، دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''

مولانا محمود الحسن دیوبندی کو کالجوں کے طلبہ سے شبلی سے کہیں زیادہ شکایتیں تھیں، لیکن مولانا کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ جب ان طلبہ میں سے انھیں کوئی مذہب کا پابند یا مذہب میں دلچسپی لینے والا ملتا تو مولانا اسے ''گوڈریوں کا لال سمجھ کر'' اس کی بے انتہا قدر کرتے، بلکہ ان کا یہ رجحان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان کے مخالف کہتے ہیں کہ ''حضرت کو نیچریوں سے مناسبت ہو گئی تھی۔'' (منقولہ در حیات شیخ الہند ص ۱۴۶)

شیخ الہند نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا، وہ ۱۹۰۶ء میں جمعیت الانصار کا قیام تھا جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے اور جس کے سلسلے میں ''علی گڑھ کالج سے یہ معاہدہ بھی ہوا تھا کہ

انگریزی خواندہ طلبہ جو تبلیغ کا شوق رکھیں، وہ دار العلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں۔ دار العلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبہ کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا جو دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔''

جمعیۃ الانصار کے سیکرٹری حضرت شیخ الہند کے معتمد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی تھے جو جماعت دیوبند میں ''حضرت شیخ کے دماغ'' گنے جاتے تھے اور جو طبعاً مخالف فریقین کے درمیان واسطہ بننے کے لیے خاص طور پر موزوں تھے۔ کچھ عرصے کے بعد چند مقامی مشکلات کی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنا کام دہلی منتقل کیا اور ۱۹۱۳ء میں وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کی بنیاد ڈالی جس کی سرپرستی میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ ساتھ حکیم اجمل خان اور نواب وقار الملک سیکرٹری علی گڑھ بھی شریک تھے۔ نواب موصوف نے نہ صرف چندوں کے لیے پرائیویٹ طور پر کوشش کی، بلکہ اخبارات میں بھی پرزور اپیل شائع کی اور لوگوں کو دائرہ کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

بدقسمتی سے ان کوششوں میں سیاسی الجھنیں حائل ہوئیں۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے بعد شیخ الہند ہندوستان سے باہر چلے گئے اور علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان علمی اور روحانی ارتباط کا کام رک گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب مولانا محمود الحسن ہندوستان واپس لوٹے تو وہ دق کے مریض اور دنوں کے مہمان تھے، لیکن دیوبند اور علی گڑھ کے امتزاج کی سب سے اہم عملی کوشش ان کے مبارک ہاتھوں سے ابھی ہونے والی تھی۔ شدید مرض کی حالت میں آپ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو ''علوم عصریہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک ایسی آزاد درس گاہ تھی جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو'' اور جو اپنی کوتاہیوں کے باوجود علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان مل کر کام کرنے والوں کا آج سب سے بڑا مرکز ہے۔

شیخ الہند کی وفات ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ہوئی اور نعش دیوبند لے جا کر دفن کی گئی۔

(ماخوذ از ''موج کوثر'')